ڈاکٹر سفیر حیدر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔
ڈاکٹر الماس خانم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔
ذیشان وکیل
شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

"اُتارے طاقِ نسیاں سے کچھ گزرے ہوئے موسم"
(انتظار حسین کی ناول نگاری ... مرکزی رجحان)

Dr. Safeer Haider
Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore.
Dr. Almas Khanum
Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore
Zeeshan Wakeel
Department of Urdu, Govt. College University, Lahore.

"Utarey Taq-e-Nisian Sy Kuch Guzry Hue Mosam"
(Intezar Hussain's novel writing….. The main Trend)

The tragedy of the past and the migration are two major and important themes in Intizar Hussein's fiction. The man in his fiction is a person who is blind and mentally handicapped without a past. The issues of migration, remembrance, and settlement at the spiritual and material level in the new land are basic topics of his entire literary work. In Intizar Hussain's fiction, man is a living symbol of many eras. Main purpose of this article is to highlight the issues of migration, connection with past, settlement in new dream land, which are being faced by characters of Intizar Hussain's Novels.

Key Words: *Progressive, Urdu Literature, Politics, Scientific, Novels, Fiction, Ahmad Nadeem Qasmi.*

''عجیب بات ہے یہ شہر آدمیوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور جگہیں بھرتی جا رہی ہیں۔ کامریڈ نے تائید میں سر ہلایا۔ ٹھیک کہتے ہو کامریڈ۔ سالا ہجوم اتنا اور آدمی غائب ۔ایک وقت آنے والا ہے کہ یہاں سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔''

(تذکرہ، ص:۹۴)

انتظار حسین کے ناولوں میں انسان کیا ہے؟ ایک یادداشت ہے۔ یادداشت کی تجسیم ہے۔ جیلانی کامران کے خیال میں انتظار حسین کے یہاں: ''یادداشت ایک تخلیقی اصول کے طور پر ناول کے انسانی منظر کو دو الگ الگ حصوں اور درجوں میں تقسیم کرتی ہے اور دو مختلف نوع کے انسان بر آمد ہوتے ہیں۔ ایسے انسان جو یادداشتوں کے رشتے سے قائم ہیں اور ایسے لوگ، جو اس بنیادی رشتے سے کٹے ہوئے ہیں۔ کھوپڑیوں کے بغیر لوگ...[۱]

انتظار حسین کا انسان یاد آوری کے مرحلے میں بے قرار نظر آتا ہے۔ ان کا مسئلہ بھی لوہسون والا ہے جس نے کہا تھا کہ ''میری مشکل یہ ہے کہ میں بھول نہیں سکتا۔''[۲] انسان ماضی کے قفل توڑ کر یادوں کے پرانے سامان پر جمی گرد صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شاید اب ان دنوں کی ''حقیقت اب محض ایک التباس سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔''[۳]

انتظار حسین کے یہاں ہجرت، یاد آوری، نئی بستی میں روحانی اور مادی سطح پر آبادکاری کے مسائل کی پیش کش ان کے پورے افسانوی ادب کا مرکزی رجحان ہے۔ اس زمین، زمانی اور مابعد الطبیعیاتی احساسِ جلاوطنی کا بیانیہ شاید اس لیے بھی زیادہ پر تاثیر ہے کہ انتظار حسین کے اسلوب میں موضوعات کی پیوستگی اپنی انتہائی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہجرت کے اداس المیے کا بیانیہ بھی اسی طرح کی اداسی اور زیرِلب سسکی کی مانند ہے۔

سراج منیر نے وقت کی مختلف سطحوں کے مابین انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کے اندر انسان کے تصور کی پانچ پرتیں نشان زد کی ہیں۔ یہ پانچ پرتیں وقت کو پانچ ادوار میں منقسم کر کے دکھائی ہیں۔ پہلے دور کو ہبوطِ آدم کے لمحے میں شناخت کیا گیا ہے، پھر یہاں ہند اسلامی تہذیب کے وقت میں انسان کا تہذیبی چہرہ ہے۔ پھر آریائی وقت ہے اور چوتھا وقت کی اسلامی تاریخ کے اندر کا تغیر و تبدل ہے اور پانچویں سطح پر عام انسانی زندگی میں وقت کا بہاؤ ہے۔ وقت کی جتنی سطحیں ہیں بستی کے کرداروں کے لیے وہ ذہنی، روحانی، جسمانی، ثقافتی، زمینی ہجرت کا دوسرا نام ہیں۔ کیونکہ انتظار حسین نے ایک ہجرت کو کئی ہجرتوں کے تسلسل میں دیکھا ہے اور اس طرح ایک بستی سے ہجرت ہر بستی سے ہجرت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

'' تذکرہ''میں انسان کو بیک وقت تینوں زمانوں کا باسی دکھایا گیا ہے اور انسان ایک ایسا تسلسل ہے جو ہمہ وقت، وقت کی تمام سطحوں پر موجود ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں انتظار حسین نے '' Space time continuum'' کا منظر دکھایا ہے جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ کائنات زمانوں، لمحوں اور ہیولوں میں تقسیم نہیں ہے۔'' (۴)

انتظار حسین نے خود ایک جگہ اپنے اندر زمانوں اور زمینوں کی یکجائی کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''زمانے اور زمینیں درہم برہم ہیں کبھی کبھی بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کہاں، کس جگ میں ہوں۔'' (۵)

انتظار حسین کا شاید ہی کوئی انٹرویو ہو جس میں ان کے ماضی پرست ہونے کے حوالے سے نرم یا سخت انداز میں سوال نہ کیا گیا ہو۔ اس حوالے سے ان کے ردِ عمل میں لہجے کی تلخی کی وہ سطح ہے جو ان کے مجموعی اسلوبِ حیات اور اسلوبِ نثر سے جداگانہ رنگ لیے ہوئے ہے جب وہ کہتے ہیں۔ ''کیا میں ہجرت کو بھول جائوں؟ اگر ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو کیا میں ۱۹۴۷ء کو فراموش کر دوں؟ اگر میں اسے بھول گیا تو پاکستان میرے لیے بے معنی ہو جائے گا۔ جس تاریخ کے پیٹ سے پاکستان پیدا ہوا ہے، اس تاریخ کو لوگ کہتے ہیں کہ بھول جائوں، حالانکہ یہ تو ناجائز اولاد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔'' (۶)

اسی لیے شمیم حنفی نے انتظار حسین کے یہاں انسان اور ماضی کے رشتے کی جدلیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ماضی، انتظار حسین کے لیے صرف ایک احساس، گمشدہ وقت کا ایک لہرا، ذہن پر بادل کی طرح چھائے ہوئے جذبوں کی ایک ترنگ نہیں ایک جیتی جاگتی واردات ہے۔''(۷)

انتظار حسین کے یہاں انسان کئی زمانوں کے سنگم کی زندہ علامت ہے۔ یہاں انسان Space time continuum میں محوِ سفر ہے۔ یہاں ماضی بھی انسانی وجود کا لازمی حصہ ہے۔ جس طرح کسی کا ہاتھ پائوں آنکھیں نہ ہوں تو وہ انسان اپاہج کہلاتا ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ماضی کے بغیر انسان ایسے ہے جیسے آنکھوں سے محروم اور ذہنی معذور۔ اس لیے ''تذکرہ'' میں جب بوا جان کو چپ لگتی ہے تو گویا وہ ان کی آواز کی روپوشی نہیں کئی زمانے روپوش ہو گئے۔ انتظار حسین کے ناولوں میں یاد آوری کا عمل بار بار پیش کیا گیا ہے۔ چھوڑی ہوئی بستی سے ملاپ کی صورت محال ہے اور خواب میں بھی تشنگی باقی رہتی ہے اور نارسائی کی خلش ہی حاصلِ عمرِ رواں ٹھہرتی ہے:

''مجید میاں، پرسوں رات ہی کی تو بات ہے۔ عجب خواب دیکھا۔ جیسے میں شکار پور گیا ہوں۔ اتنا خوش، اتنا خوش، بس کچھ مت پوچھو اور حیران بھی، حیران یہ دیکھ کر ہو رہا تھا

کہ شکار پور اتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔ اُونچی اُونچی پکی عمارتیں جیسے محل ہوں۔ میاں تم یقین کرو گے کوئی کچا گھر نہیں اور سڑکیں ،وہ دھول سے اٹی کچی پکی گڑھوں والی سڑکیں سب غائب۔ یہاں سے وہاں تک پکی ہموار سڑکیں شیشے کی طرح چمکتی ہوئی اور موٹریں چل رہی تھیں۔ میں حیران کے اسّے کہاں گئے۔ کوئی بھی اکہ نہیں تھا۔ ایک ربر ٹائر تانگہ دوڑا چلا جا رہا تھا اور ہماری گلی کیسی چم چم کر رہی تھی۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا مگر سکون بہت تھا۔ بس میں مڑا ہی تھا کہ آنکھ کھل گئی۔'' رکے ، پھر بولے۔ ''بہت افسوس ہوا۔ کس وقت آنکھ کھلی ہے۔ ہمیشہ خواب میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوش خوش اپنے گھر کی جانب جاتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اب آیا گھر۔ مگر اُدھر گلی میں قدم رکھا اور آنکھ کھل گئی۔''(۸)

بظاہر طاقِ نسیاں، حافظے کا متبادل بھی بن چکا ہو تو بھی کوئی خط، کوئی بازگشت، کوئی لمحہ گزرے ہوئے ماہ و سال کے در وا کر دیتا ہے۔

''بہت مشکل ہے میں تو جتنا بھی ہوں ماضی ہی میں ہوں۔''

''حال میں ہونے کی کوشش کرو۔''

''مگر کیسے ؟''(۹)

کبھی کہیں دور افتادوں کے خط ماضی کے بند دریچے کھول دیتے ہیں تو کہیں کوئی درخت یاد آوری کی دھول اڑانا شروع کر دیتا ہے۔ بقول ایک کردار کے کہ:'' ویسے یار، عبدالرحمٰن اول نے کھجور کا پیڑ بو کر اچھا نہیں کیا۔ طارق بن زیاد کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ واپسی کا راستہ پھر سے کھول دیا ہر کھجور ایک سرنگ تھی کہ اس میں اترو اور اپنے صحرا میں جا نکلو۔''(۱۰)

انتظار حسین کے نزدیک یہ ممکن نہیں کہ انسان تہذیبی کٹائو کے بعد اپنی شناخت برقرار رکھ سکے اس لیے انہوں نے انسان کو وسیع تاریخی اور تہذیبی تناظر میں پیش کیا ہے بلکہ ان کے نزدیک انسان اپنی تاریخ، تہذیب اور ہمہ جہت ماضی سے اٹوٹ جڑت کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔ نہ صرف گزرے ہوئے کل کو دھیان میں رکھے بلکہ انسانی رشتوں اور عادتوں کے ساتھ ساتھ درختوں اور پرندوں تک کی ذہنی بازیافت ضروری ہے۔ کھوئی ہوئی

بستی میں جانا لازم ہے چاہے خواب کی صورت میں جانا پڑے۔ انتظار حسین انسانی ہستی کی تفہیم کے لیے وقت کے حصار کو توڑ دیتے ہیں ''بستی'' کے تناظر میں اس پہلو پر شمیم حنفی نے یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''تاریخ انتظار کے لیے تجربہ بنتی ہے اور واقعی انکشاف بنتا ہے۔ انسانی ہستی اور کائنات کے تسلسل کا شعور، گزشتہ، موجود اور آئندہ کی حد بندیوں سے آزاد بصیرت، سیاسی واردات کے تئیں ایک ہمہ گیر موقف (جو اس واردات کا سراعام انسانی صورتحال سے جوڑ دیتا ہے اس سب تک انتظار حسین اپنے حافظے ہی کے واسطے سے ہو کر پہنچتے ہیں۔ بقول مظفر علی سید، 'بستی' میں 'عصری معنویت، تہذیبی تقابل اور نفسیاتی بصیرت ایک ہمہ جہت اسلوب بیان کی شکل میں بیک وقت موجود ہے۔' اس جملے میں ''تہذیبی تقابل'' کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ انتظار حسین کے یہاں حافظہ اس تہذیبی تقابل کا وسیلہ بھی ہے جس کی مدد سے وہ حال کو ماضی کے آئینے میں صرف دیکھتے ہی نہیں، انسان، کائنات کے ارتقاء میں اس حال کی حیثیت کا تعین بھی کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو ''بستی'' انتظار حسین کے گردوپیش کی سیاسی صورتحال پر اس درجہ موثر تخلیقی تبصرہ Critique نہ بنتی۔ انسان طبعی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر اک ساتھ زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے، ایک کو دوسرے کی تفہیم کا ذریعہ بناتا ہے اور اپنی ہستی کے واسطے سے ہی اس ثنویت کو ایک اکائی کی شکل دیتا ہے۔''(۱۱)

برِ صغیر کی تقسیم کے پس منظر میں ہجرت کے سیاسی نتائج اور انسانی زندگیوں پر اثرات نمایاں ہیں۔ گروہی، لسّانی، جغرافیائی سیاست میں منقسم سیاسی انسان اور انسانی زندگی کے حوالے سے سیاسی انسکلات تقریباً ہر ناول میں موجود ہیں۔ ''تذکرہ'' کے حوالے سے شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ ''تقسیم اور اس واقعے کے سیاسی انسکلات نے انسانی صورتحال کے جتنے دائروں پر اثر ڈالا تھا انتظار حسین نے ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔''(۱۲)

''تذکرہ'' کے آخری جملوں میں ایک مکمل لایعنی مسافت کے لایعنی حاصل پر اکتاہٹ کی نشاندہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے ثمر جستجو سے پیدا شدہ تھکن اور اضمحلال کی کیفیت نمایاں تر انداز میں پیش کی گئی ہے ''بستی'' میں جس بشارت کا ذکر ملتا ہے۔ ''تذکرہ'' میں وہ بشارت یاس کی تاریکیوں میں ڈوبتی محسوس ہوتی ہے۔

یقیناً اس کے پس منظر میں پاکستانی معاشرے کا وہ سفر بھی ہے جس میں حرکت تیز تر تھی لیکن رستہ آہستہ آہستہ بھی طے ہوتا نظر نہیں آرہا تھا:

''کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔
کب تک۔ اس لمبی کالی رات کا کوئی انت ہے کہ نہیں۔ اجالا اور کنارا ہے کہ نہیں۔
اُجالا اور کنارہ کہیں ہے کہ نہیں اور درخت؟''(۱۳)

انتظار حسین کے ناول ہوں، افسانے یا تنقید وہ اپنے علامتی انداز کے ذریعے اپنی تحریر کو زیادہ معنوی، دبازت، گہرائی اور کثیر الجہت تعبیروں کی حامل بنادیتے ہیں۔ واقعہ کربلا، تقسیمِ ہند، سقوطِ ڈھاکہ وغیرہ کے دوران انسانی درندگی کے واقعات کی علامتی پیش کش ان کے ہاں نمایاں ہے۔ فسادات کو وہ براہِ راست پیش نہیں کرتے اور نہ فسادات کے ذمہ دار کرداروں کا مطالعہ لیکن پسِ حرف انسانیت کی سسکی اور اخراجِ بشریت کے مرحلے پر موجود انسانی درندوں کی غراہٹ واضح سنائی دے جاتی ہے۔ جیسے ''تذکرہ'' میں اخلاق جب درخت کٹنے پر احتجاجاً گھر چھوڑ دیتا ہے اور بعد ازاں سوچتا ہے کہ ''میں خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا۔ درخت کٹ رہے تھے تو کٹنے دیتا۔ آخر آدم بھی تو اتنا کٹ گیا اور کٹتا ہی چلا جارہا ہے۔ میں نے اس پر کب احتجاج کیا۔''(۱۴)

''تذکرہ'' میں ہجوم کے جلوسے ابھرتے انسان کی تصویریں نمایاں ہیں۔ پھانسی پر لٹکتے اپنے ہم جنسوں کا تماشہ دیکھنے والے انسانوں کی بے قراری کے کیا کہنے۔ اخلاق کے دفتر کا حال یہ ہے کہ میز میز پر ایک ہی موضوع زیرِ گفتگو ہے۔ ہر چپراسی اور ہر کلرک اس قدر بے تاب ہے کہ اڑ کر دفتر سے، جائے واردات پر پہنچنا چاہتا ہے۔ کچھ دانشور قسم کے حضرات کی یہ تجویز بھی تھی کہ دفتر میں ہاف ڈے ہونا چاہیے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ پھانسیوں کے بعد پہنچے تو وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اخلاق جب گھر کے لیے نکلا تو اسے اپنا راستہ بدلنا پڑا کیونکہ جیل والی سڑک اتنی بھر چکی تھی کہ اس کے سکوٹر جیسی چھوٹی سواری پر بھی وہاں سے گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب وہ آڑے ترچھے راستوں سے گھوم پھر کر اپنے گھر پہنچا تو گلی میں گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی گھر پہنچا تو زبیدہ نے اسے بتایا کہ لوگوں نے اس کی ناک میں دم کر رکھا ہے کیونکہ وہ ان کے گھر کی چھت پہ جا کر وہاں سے پھانسیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اخلاق لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگاتا ہے اور باور کراتا ہے کہ یہ اس کا گھر ہے کوئی تماشا گاہ نہیں ہے۔

''ایک دفعہ پھر دروازے کی گھنٹی بجی اور ساتھ میں کسی نے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ اجنبی کو دیکھا روکھے پن سے پوچھا: 'جی فرمایئے' لجاجت سے بولا: 'اگر آپ تھوڑی دیر مہربانی کریں اور اک ذرا اجازت دے دیں تو میں آپ کی چھت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔' میں نے بے صبری سے اس کی بات کاٹی 'آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ یہ گھر ہے یہاں شریف لوگ رہتے ہیں آپ نے اس گھر کو کیا سمجھا ہے؟'

'دیکھیے آپ برا مان گئے، قصہ یہ ہے کہ میں بہت دور سے آیا ہوں۔'

'بہت دور سے؟ کہاں سے؟'

'فیصل آباد سے؟'

'جی ہاں، یہی سوچا تھا کہ ذرا آئوٹنگ ہو جائے گی، پھانسیاں بھی دیکھ لیں گے۔'' (۱۵)

''قتلام کا تماشا''، دیکھنے کی روایت کو زندہ رکھنے کے شائق ہر عمر کے لوگ امڈے آرہے تھے۔ اس کا دوست کامریڈ جو پھانسیاں دیکھنے والوں کا تماشا دیکھتا دیکھتا وہاں چلا آیا تھا اس کو اخلاق جل کر کہتا ہے کہ ''کامریڈ یہ سب سالے تمہارے عوام ہیں جن کا تم اُٹھتے بیٹھتے قصیدہ پڑھتے ہو۔'' کامریڈ اسے یاد دلاتا ہے کہ کوڑے لگنے کے موقع پر تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ اسی دوران دوبارہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اخلاق نے جا کر دروازہ کھولا۔

انتظار حسین کے مرکزی کردار وقت سے الجھتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید ان کے المیوں کا بانی وقت کا سیلِ رواں ہے۔ جو بے لحاظ اور بے مروّت ہے جو ہنستی بستی بستیوں اور ہرے بھرے اشجار اور چہکتے پرندوں کو چاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ہستی کو نیستی بناڈالتا ہے۔ انتظار حسین کے ''وقت دیمک ہے اور دیمک وقت ہے۔'' جیسے خیالات کئی جگہوں پر ملتے ہیں۔ لیکن وقت کا سفر ان کے کرداروں کے لیے حیرت کا باعث بھی ہے اور زمانے آپس میں درہم برہم ہو کر بھی ان کی باطنی دنیا میں ہلچل مچاتے رہتے ہیں۔ وقت کے اس دائرے میں انسان کی کشمکش کی تصویر انتظار حسین کے تقریباً تمام ناولوں میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ''بستی'' کے یہ جملے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں: ''وقت گزرتا کہاں ہے؟ گزرتا ہے پر نہیں گزرتا، آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔''(۱۶) بستی میں انسانی صورتحال اور انسان کی جبلت پر اٹھائے گئے سوالات کو ہاتھی اور کچھوے کی دائمی جنگ کے قصے کے ذریعے اٹھایا گیا ہے۔

انتظار حسین انسان کو پرندے کی تمثیل کی روایت میں دیکھنے کے متمنی ہیں گھونسلے سے مانوس، سرِ شام واپسی کا خواب اور پر امن چہکاروں بھری صبح۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے انتظار حسین کے ساتھ مطبوعہ مکالمے کو بھی

''گمشدہ پرندوں کی آواز''[۱۷] سے معنون کیا تھا۔انتظار حسین کے ایک کردار اخلاق کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اس منظر کو موضوعِ بحث بنایا ہے جب وہ ماضی کی گم گشتہ یادوں کی باز آفرینی شیریں کے ساتھ مل کر کرتا ہے اور مظاہرِ فطرت کی موجودگی کے امر حقیقی سے جڑ جاتا ہے کہ شاید اس طرح وہ چراغ حویلی اور اس کی قدیم بستی میں وقوع پزیر ہونے والی برق رفتار تبدیلیوں کی زد سے بھی محفوظ رہ سکے۔اور خود کو ہار سنگھار کے پودے، چڑیوں ،گلہریوں اور بلبلوں کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرتا ہے بقول ڈاکٹر وزیر آغا''ان نادر و نایاب لمحات میں جب وہ پرندوں کے ساتھ مل کر خود بھی ایک پرندہ بن جاتا ہے تو اس کے چاروں طرف کی اتھل پتھل گویا رک سی جاتی ہے''[۱۸] ڈاکٹر وزیر آغا نے اس لمحے کو جدید مفکرین کے حوالے سے 'Isness' قرار دیا ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں میں احساسِ جرم کا موقف بڑا واضح ہے۔ان کے اکثر کرداروں کا مجرم ضمیر اپنی چھوڑی ہوئی زمین بستیوں گلیوں ،دکانوں ،درختوں اور انسانوں سے انقطاع تعلق کی خلش میں مبتلا نظر آتا ہے۔یہ انقطاع بقول اسلوب احمد انصاری:''ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔''[۱۹] اور ''آگے سمندر ہے'' کے جواد میاں کے کردار کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ان کے ویاس پور پہنچنے کے پس منظر میں ایک عنصر ان کی باطنی ملامت کا بھی تھا۔ مجو بھائی کے کچوکوں کا بھی اثر تھا اور ان کی علمی رہنمائی بھی کارگر ثابت ہوئی۔زمین سے انقطاع کے علاوہ رشتوں سے انقطاع بھی ہے۔ میمونہ سے شادی کے امکان کو رد کرتے ہوئے جواد بھارت سے واپسی کا فیصلہ کر لیتا ہے لیکن احساسِ جرم کے امکان کو رد کرنا مشکل ہے۔'آگے سمندر' میں یہ جملے قابلِ توجہ ہیں۔

''تم نے سفر کا کشٹ بھی اٹھایا، اور اسے پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچایا۔ تم سفر کو ادھورا چھوڑ کر آئے ہو۔یہ ادھ چھوڑا سفر تمہیں ستائے گا اور پیارے میر اخیال ہے کہ اس نے تمہیں ستانا شروع کر دیا۔''[۲۰]

انتظار حسین کا انسان مغائرت اور بے رشتگی کے احساس تلے دبا نظر آتا ہے۔اس کے لیے دو طرفہ اجنبیت ہے کہ نئی زمین سے نئے رشتے میں گہرائی ناپید ہے اور دوسری طرف جب وہی کردار چھوڑی ہوئی بستیوں میں لوٹتے ہیں تو وہاں کے پرانے منظروں کی بازیافت میں بھی ناکام رہتے ہیں کیونکہ چھوڑے ہوئے گلی کوچے اور انسانی کرداروں کے آپس کے رشتے اپنی ماہئیت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔جواد میاں کی ویاس پور کو مراجعت اور ذہنی ردِ عمل میں مغائرت کا یہ عنصر بہت واضح ہے۔وہ ویاس پور کی تبدیل شدہ شکل سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا اور بیگانگی کا یہ احساس ایک سطحی نہیں کیونکہ اس کے نزدیک ''ویاس پور'' اور دلکشا کا مکانی حلیہ ہی نہیں بدل گیا ہے بلکہ اشیاء اور افراد کے مابین اندرونی رشتے اور علائق بھی جوہر آن، وقت کی سیلِ بے اماں کی زد پر رہتے ہیں۔'' [۲۱]

ہجرت اگر بے ثمر رہے تو انسانی شخصیت پرت در پرت زخمی ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں بھی انسان جب مکہ جانے کے لیے نکلتے ہیں تو کوفہ پہنچ جاتے ہیں۔ انتظار حسین نے ایک انسان کو ہجرت کے تجربے کے لینڈ اسکیپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سراج منیر کے خیال میں ہجرت انتظار حسین کے یہاں مرکزی استعارہ ہے اور ''اس کے ذریعے انتظار حسین نے اسے ایک بین التہذیبی معنی دینے کی کوشش کی ہے اور اس کی معرفت اپنی شخصیت کے تانے بانے میں حتمی اکائی کی تلاش کا سفر کیا ہے۔'' (۲۲)

''بستی'' کے ذاکر اور اس کا خاندان جنگ کے انتہائی دنوں میں نئی بستی کو چھوڑ کر نہیں جاتے اور ان کا یہی رویہ تیس پینتیس سال پہلے بھی تھا جب طاعون کی وبا کے دوران وہ روپ نگر کو چھوڑ کر نہیں گئے تھے اس حوالے سے مظفر علی سید نے بستی کی نمایاں شخصیات مولانا ناصر علی اور صابرہ کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان دو مختلف ہستیوں میں اجتماعی اور اندرونی دونوں صورتحال سے اثر پذیر ہونے کی جو دہری صلاحیت ہے وہی ان کی واقعاتی شبیہوں کو مثبت انسانیت کی مثالی معنویت بھی عطا کرتی ہے۔''(۲۳)

سراج منیر نے انتظار حسین کے کرداروں کی مماثلتیں جب ہارڈی کے کرداروں کے ساتھ تلاش کیں تو انتظار حسین کے تصورِ انسان کی بھی وضاحت کر دی۔

''ہارڈی کے ہاں یاد اور ہجرت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک بامعنی، پر محبت کائنات سے جلاوطنی کا ہے لیکن کائنات اس کے لیے پر اسرار ہے بالکل اسی طرح جیسے انتظار حسین کے لیے۔ ہارڈی کا کہنا ہے:

> ''اور آدھے وقت تو میں سایوں، پر اسرار آوازوں، وجدان، خواب اور آسیبی جگہوں میں یقین رکھتا ہوں'' اصل میں انتظار حسین اور ہارڈی ایک ہی مٹی کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک اپنی پر اسرار کائنات سے جلاوطن کر دیا گیا ہے اور اسے یقین ہے کہ آدمی کے معنی ہیں المیہ کا کردار ہونا۔۔۔۔ دوسرے نے اپنی زمین اور اپنے بھید بھرے بچپن اور ایک پورے تصورِ کائنات سے ہجرت کی ہے۔ یاد اس کے لیے بازیافت کا طریقہ ہے اور کہانی اس کا راستہ ہے۔''(۲۴)

انتظار حسین نے بطور انسان ایک تہذیب سے ہجرت کو ہر تہذیب سے ہجرت کہا ہے۔ ''آگے سمندر ہے'' میں مرکزی کردار جواد کے ذریعے انسانی صورتحال کو کراچی کے کینوس پر واضح کیا گیا ہے تو اس میں مجّو بھائی کا جملہ کئی بار ناول میں آیا ہے:

''سوچنا چھوڑ دو، یا اس شہر کو چھوڑ دو''

وجودیت کے مباحث میں خوف ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرکیگارڈ نے تو اپنی کتاب کا نام ہی ''Fear and Tremblling'' رکھا تھا۔ ''چاند گہن'' میں فیاض کے کردار کی صورت میں انسان کے وجودی خوف کی تجسیم نظر آتی ہے جو جسم اور روح کی تھکن کا احساس زائل ہونے کے بعد ایک پتھرائی ہوئی کیفیت میں ہے لیکن خوف کے حملے لگاتار جاری ہیں اور اس کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈرائونی صورتوں والے بندر اس پر لپک رہے ہیں اور وہ محض اتنی قدرت رکھتا ہے کہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہے۔ کیونکہ قوت مدافعت یکسر زائل ہو چکی ہے دل رفتہ رفتہ اس کے اوپر قابض ہونے والی جمود کی کیفیت کا شکار بنتا جا رہا ہے۔ دراصل خوف انسانی وجود کے چاند کے لیے گہن ہے۔ ''گہن؟۔۔۔۔ چاند کو گہن لگ رہا ہے۔ دھیرے۔۔۔۔۔۔۔ میں گہنا رہا ہوں یعنی فیاض اس کی روح گہنا رہی ہے۔''(۲۵)

''چاند گہن'' کی ابتداء میں انجیل کے عہد نامہ عتیق کے دو اقتباسات دیئے گئے ہیں بقول آصف فرخی ''ان کے ذریعے مصنف ہمیں کیا باور کرانا چاہ رہا ہے؟ کیا ہم اس کہانی کو ان حوالوں کے ساتھ سمجھیں اور قبول کریں؟ یا پھر اس کہانی کے کردار، فیاض خاں سمیت، عہد نامہ عتیق کے اذیت رسیدہ اور زخم خوردہ پیغمبر ''بے امت رسول'' جن کے ہاں دربدری، جلاوطنی اور قوم کی بے اعتباری کا مستقل سلسلہ ستم در ستم بن کر ٹوٹ رہا ہے۔'' (۲۶)

''چاند گہن'' میں سہمی ہوئی انسانی شکلیں ہیں جو خوف کے آئینے میں اپنے لرزاں عکس دیکھ کر سراسیمگی کا شکار ہیں ناول کی ابتدائی منظر کشی میں غالب عنصر خوف کا ہے۔ ''ناول کا آغاز خوف سے ہوتا ہے اور یہ بوجی کا خوف ہے، جو ذرا سے کھٹکے پر ڈر جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک فطرت نے غریب انسان کے خلاف لام بندی کر رکھی ہے۔

اس خوف کی مجسم تصویر بوجی کا کردار ہے بُوجی کے اندر خوف اس قدر براجمان ہے کہ ذرا سے کھٹکے پر ان کا پورا وجود لرز اٹھتا ہے اور کسی انہونی کا احساس ان کے رگ وپے میں پھیل جاتا ہے بُوجی ان انسانی کرداروں کی علامت ہیں جن کے لیے ہر آہٹ، ہر آواز اور مظاہرِ فطرت کا ہر اشارہ کسی منتظر قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ بقول آصف فرخی بُوجی کے لیے ''کائنات اُوپر سے اُترتے اندھیروں اور unexplained آوازوں کا مجموعہ ہے۔'' (۲۷)

انتظار حسین کے یہاں انسان کی شناخت خوف کے استعارے کے طور پر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رضی عابدی نے اس حوالے سے انتظار حسین کی اپنے کرداروں کی پیش کش ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ عہد نامہ قدیم داستانوں اور ہند

دیومالا اور فسادات کی تصویروں کے مجموعی انجذاب کے طور پر نشاندہی کی ہے۔''بہت حد تک قرینِ قیاس ہے کہ خوف و دہشت کی اِس طرح کی تصویر کشی کا فن انہوں نے براہِ راست ٹی۔ایس۔ایلیٹ سے ہی لیا ہو۔''(۲۸)

''یوں لگتا کہ فضا کی گھگھی بندھ گئی ہے۔۔۔۔۔۔''(۲۹)

''اے بڑے شہر۔۔۔۔۔۔۔اے بستیوں کی ملکہ۔۔۔۔افسوس۔افسوس۔۔۔۔۔۔''(۳۰)

انتظار حسین کے ناولوں میں عورت اور مرد کے رشتے کا بیانیہ اس انداز میں زیرِ بحث نہیں آتا ہے جس طرح اکثر ناول نگاروں کے یہاں کھلم کھلا پایا جاتا ہے۔اس کا ایک سبب تو ان کے مجموعی اسلوب کا رنگ بھی ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ عورت کو بطور انسان دیکھتے ہیں اس کی ایک نگاہ جو نگاہ بھی نہیں اس کی جمالیات کو اپنے بیانیاتی آئینے میں اتارنا چاہتے ہیں۔بقول غیاث اقبال:'' ٹیگور کی طرح انتظار حسین روحانی رفعتوں کی نہیں سوچتے بلکہ جنس کو جمالیاتی بنا کر حسیات کے اندر Concentrate کر دیتے ہیں۔''(۳۱) جب عورت کے بھرپور وجود کی کمی کے حوالے سے انتظار حسین کے ناولوں اور افسانوں کو تنقیص کا نشانہ بنایا گیا تو اس پر ان کا ردِ عمل کچھ اس طرح سامنے آیا۔

''عورت یعنی چہ؟ محض جنسی جانور؟ پھر مرد کو بھی اسی خانے میں رکھیے۔یہ کوئی الگ جانور تو نہیں۔'اسی مادہ کا نر'عورت اور مرد کے درمیان جو ایک پراسرار رشتہ چلا آتا ہے،وہ کیا ہے؟اس کی تکمیل تو جنسی تجربے میں ہی جا کے ہوئی ہے۔مگر یہ کیا ہوتا ہے۔کہ کچھ بھی نہیں ہوتا اور پھر بھی اتنا کچھ ہو جاتا ہے!اور وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے بھی کم ہوتی ہے۔آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر جاتی ہے!بس اس کیا کچھ پر میری حیرت جاگتی ہے!میں نے کتنی کوشش کی ہے کہ یہ کیا کچھ میری گرفت میں آجائے۔''(۳۲)

''آگے سمندر ہے'' میں انسانی نفسیات کو'شہرِ ناپرساں'کے کینوس پر ابھارا گیا ہے۔یہاں تقسیم کے بعد بے سروساماں لوگ کراچی میں بستے دکھائے گئے ہیں تو یہ وہ'عہد ساز دور'تھا جب جھگی پر قبضہ ملک فتح کرنے کے مترادف تھا۔بعد ازاں'فزوں طلبی'نے بڑے رنگ دکھائے۔جھگیوں کے خمیر سے اٹھے ہوئے شہر کراچی میں جب جو اد وارد ہوا اور جھگی میں رہنا شروع ہوا تو اس کے بقول بڑے بڑے اینٹھے خاں، جنٹلمین، چھیل چھکینا، طرم باز، رئیس زادے، شائستہ طبع، نفاست پسند، خوش پوش اور کج مکدہ، جھگیوں کے باسی تھے۔جھگی بھی بڑے جتنوں سے ملتی تھی اور جھگی کال کے اس عارضی دور کے بعد آسمان میں تھگلی لگانے والوں نے نئے شہر کے اندر پوشیدہ امکانات کو کھنگالا اور یوں جھگی کال کے بطن میں جو فلیٹوں، کوٹھیوں، پلازائوں کا زمانہ کُلبلا رہا تھا، زندہ ہستی کے طور پر سامنے آگیا۔

یہاں پر انتظار حسین نے ابنِ آدم کے اندر ابن الوقتی کی بے انتہا مخفی صلاحیت کے عملی کردار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ''تو آپ آدمی کی جڑیں شہر میں تلاش کرتے ہیں۔ مگر شہر کی اپنی بھی تو جڑیں ہونی چاہئیں۔ اماں بائولے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پر تیرتا ہے۔'' (۳۳)

ابتداء میں جب لوگ 'جھگی کال' کے دور سے گزر رہے تھے تو اس وقت وہ اپنے نام کے سابقے لاحقے بھولے ہوئے تھے۔ کہیں سر چھپانے کی فکر میں سرگرداں اور کبھی پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے دربدر تھے اس وقت تو جب کوئی پوچھتا تھا کہ ''کس شہر سے وارد ہوئے ہو؟'' تو جواب ملتا تھا کہ ''جو بھی شہر تھا پیچھے رہ گیا۔ اب تو اس شہر میں ہوں۔'' لیکن جب لوگ ذرا خوشحال ہوئے۔ جیبیں اور پیٹ بھرنے لگے تو انسانی فطرت بے نقاب ہونا شروع ہوئی۔ 'فزوں طلبی' نے شہر کا امن برباد کرنا شروع کیا لوگوں کو اپنی اپنی ذاتیں پاتیں علاقائی اور لسانی وابستگیاں کچھ ایسے منفی انداز میں یاد آئیں کہ تعصبات کی صورت میں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ مثلاً حالات اتنے دگرگوں ہوئے تو جواد جیسے حساس آدمی نے محسوس کیا کہ دُور دُور گرجنے والا سیلاب اب ان گھروں کی دہلیز تک آپہنچا ہے تو پہلے تو وہ مجو بھائی سے عالمِ حیرت میں پوچھتا ہے کہ ''مجو بھائی، اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پھر قدرے طویل تبصرے میں وضاحت کرتا ہے کہ شہر قلبِ ماہئیت کے عمل سے گزر رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ شہر ہی نہیں رہا۔ ''آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں یہ تو تباہی کا راستہ ہے۔'' تو مجو بھائی اسے بڑے غور سے سُننے کے بعد اور ذرا سی حیل حجت اور ظاہری بے نیازی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرنے کے بعد ایک نسخہ کیمیاء اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مختصر مگر جامع جملے کی صورت میں ہر درد کی دوا یہ بتاتے ہیں کہ ''سوچنا چھوڑ دو یا پھر اس شہر کو چھوڑ دو۔' (۳۴) جہاں چیزیں درد مندوں کی شکستگی کے اعلامیے کے طور پر سامنے آتی ہیں وہاں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ انسانی فطرت کے اسرار کی تفہیم کا عمل کہیں رکتا نہیں۔ ہجرت کے دوران وقوع پذیر ہونے والے حادثات کے بوجھ تلے وقتی طور پر جو کینہ، فرقہ پرستی، علاقائی اور لسانی تعصبات دب گئے تھے، دوبارہ جاگ اٹھے۔ ان بیماریوں کے جرثوموں کی بیداری کا منظر بظاہر کراچی کے پردے میں دکھایا گیا اور اب جب نئی زمین نے مہاجرین کے لیے اپنی آغوش وا کر دی اور انہیں آسودگی میسر آئی تو انسان کے اندر جو ناشکری کا مادہ ہے اس نے سر اُٹھایا (قرآن میں انسانی فطرت کے اس پہلو کو بار بار اُجاگر کیا گیا ہے)۔

''مگر اے بھین، کراچی میں جو ہو رہا ہے وہ تو کبھی دُنیا کے پردے پر نہ ہوا ہو گا۔''(۳۵)

توصیف محض اس خوشی میں کباب پر اٹھوں کی دعوت دے رہا ہے کہ ''ہمارے علاقے میں آج کرفیو اٹھا ہے۔'' جب مجّو بھائی اسے یاد دلاتے ہیں کہ شہر میں قیامت ٹوٹی ہوئی ہے اور اس کو عیاشیاں سوجھ رہی ہیں، خدا کا خوف کرنا چاہیے تو اس پر توصیف کہتا ہے کہ ''جینے کے لیے کوئی نہ کوئی فلسفہ تو تراشنا پڑے گا۔ اگر یہ نہیں تو پھر آپ بتادیجئیے کہ کراچی میں زندہ رہنے کا اور کیا نسخہ ہو سکتا ہے۔'' اور توصیف، مجّو بھائی کو یہ بھی باور کراتا ہے کہ اس کا نسخہ ان کے نسخے سے زیادہ مختلف نہیں کہ ''سوچنا چھوڑ دو یا پھر اس شہر کو چھوڑ دو۔'' اب ناموں کے ساتھ بدایوں والا، میرٹھی، سندیلوی، ڈبائیوں، امروہی، بہاری، دہلوی وغیرہ کے لاحقے لازمی ٹھہرے۔ ''ست خصمی'' شہر میں سندھی بلوچی، پنجابی، پٹھان اور مہاجر کی تقسیم واضح ہونے لگی۔ یو۔پی کے گمنام قصبے بھی، کوس لمن الملکی، بجا رہے تھے۔ افراد ایک قوم کی صورت میں نہ ڈھل سکے۔

> ''یہ شہر ست خصمی شہر ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر۔۔۔۔۔۔۔ یاروں نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے... اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑا ہی ہے، کوئی پورب، کوئی پچھم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا، سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور اس سمندر میں آکر رل مل گئیں مگر ملیں کہاں۔ یہی تو مصیبت ہے۔ ہر ندی کہتی ہے کہ میں سمندر ہوں۔'' (۳۶)

یہاں ''آگے سمندر ہے'' میں انسانی فہم، ادراک، فطرت اور جبلت کو جغرافیائی اور لسانی تناظر میں زیرِ بحث لایا گیا ہے اور انتظار حسین نے اس تاریخی موڑ کی نشاندہی کی ہے جہاں علاقائی اور لسانی تکبر اور تعصب میں گندھے ہوئے انسان کی تصویر ملتی ہے۔ بارہا کی شکستوں، غداریوں، جنگِ آزادی کے بعد کچلے جانے اور تقسیم کے فسادات کے باوجود ایسے مثالیت پسندوں کی مثالیت کے غبارے سے ہوا نہیں نکلتی جو اپنی نام نہاد اسلام پرستی کے بل بوتے پر غزوۂ بدر کی فتح کے خواب کی تعبیر کو دہرانا چاہتے ہیں۔ ان مولویوں کی باقیات سے تاحال جان نہیں چھوٹ سکی جو پریس سے چھپنے والی کتاب کے دشمن تھے اور ریل گاڑی پر سفر کرنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ انتظار حسین نے اپنے وزن سے کہیں زیادہ ٹھوس خواب بننے والے کھوکھلے انسانوں کا نمائندہ کردار ''آگے سمندر ہے'' میں عطاءاللہ غازی کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔ جو مغرب کی سائنس اور فلسفہ کو محض الحاد کا سرچشمہ سمجھتا ہے اور اس کے افادی پہلوئوں کا منکر ہے۔ وہ علم کے سرچشموں کو خارزار سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا جنون بقول اس کے عقل و ادراک کی ان عیاریوں کو نہیں مانتا اور اس کے نزدیک یہ سراسر ابولہبی ہے اسے تین سو

تیرہ دیوانوں کی تلاش ہے جو آج کے ابو جہلوں اور ابولہبوں سے مقابلہ کر سکیں اور جن کا جنون مشرق و مغرب کی اسلام دشمنی کے پہاڑوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دے۔ وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ "تین سو تیرہ سچے مسلمان، جس روز یہ اکٹھے ہو گئے اس روز عطا اللہ خاں غازی کراچی شہر میں نظر نہیں آئے گا۔ بارڈر کے اس پار ہو گا پہلی نماز بابری مسجد میں، دوسری نماز مسجدِ اقصیٰ میں۔" (۳۷)

انسانی معاشرہ سمندر سے تعبیر کیا جائے تو ہر ندی اس کی اکائی ہے۔ سمندر میں ہر ندی اپنی انفرادیت پر شور کناں ہو تو سمندر میں انفرادیت کی لہریں پانیوں کے اندر تصادم کی صورتحال پیدا کریں گی جو بھنور در بھنور مسافروں کو ڈبوتی جائیں گی۔ اس سمندر کے استعارے کو انتظار حسین نے "آگے سمندر ہے" میں کئی معنوں میں استعمال کیا ہے اس شہر کے اندرونی انتشار کو یوں بیان کیا ہے:

> "مجّو بھائی نے صحیح کہا تھا کہ اپنا شہر ست خصمی شہر ہے۔ جیسے یہ شہر نہ ہو سمندر ہو گیا کہ برِ صغیر کی ہر ندی، پرنالہ بہتا، شور مچاتا آیا اور اس میں آن ملا۔ مگر ندیاں تو سمندر میں مل کر اسی میں رل مل جاتی ہیں یاں ہر ندی شور کر رہی ہے کہ میں سمندر ہوں۔" (۳۸)

حوالہ جات

1. Intezar Hussain, tazkira, Lahore: sang-e-meel publications, 1987, p: 259
2. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain.... Ek dabistan, Delhi: Educational publishing house, 1996, p: 377
3. Uslob Ahmad Ansari, Urdu k pndrh Novel, Lucknow: Universal book house, 2003, p: 394
4. Asif farkhi, Intezar Hussain... Shkhsiat o fan, Islamabad, academy Adbiat Pakistan, 2006, p: 103
5. Ayzn p: 108

6. Ayzn p: 110
7. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain... Ek dabistan, p: 439
8. Intezar Hussain, aagy smndar hai, p: 298
9. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain, Ek dabistan, p:441-442
10. Ayzn, p:444
11. Intezar Hussain, tazkira, p: 294-295
12. Ayzn, p: 30
13. Ayzn, p: 55
14. Intezar Hussain, basti, Lahore: Sang-e-meel publications, 1994, p: 204
15. Sohail Ahmad Khan, doctor, majmua, Lahore, Sang-e-meel publications, 2009, p: 440
16. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain, Ek dabistan, p:380
17. Uslob Ahmad Ansari, Urdu k pndrh Novel, p: 382
18. Intezar Hussain, aagy smndar hai, p:18
19. Uslob Ahmad Ansari, Urdu k pndrh Novel, p:384
20. Irtiza Kareem, Intezar Hussain- Ek dabistan, p: 366-367
21. Ayzn p:384
22. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain, Ek dabistab, p: 340
23. Intezar Hussain, Chand gahn, Lahore maqtabh karwan, 1953, p: 300
24. Ayzn p:88
25. Ayzn p:80
26. Razi Abdi, teen novel nigar : polymer publications, 1986, p: 114

27. Intezar Hussain, Chand gahn, p: 53
28. Ayzn, p: 87
29. Irtiza Kareem, doctor, Intezar Hussain, Ek dabistan, p: 340
30. Ayzn, p: 296
31. Intezar Hussain, aagy smndar hai, p: 47
32. Ayzn, p: 60
33. Ayzn, p: 50
34. Ayzn, p: 38-39
35. Ayzn, p:65
36. Ayzn,p: 57-58